حسنین : اسلامی تاریخ کے دو علامتی کردار

حسن اور حسین، اسلامی تاریخ میں دو مختلف قسم کے طریق کار کی علامت ہیں۔ حسین سیاسی طریق کار کی علامت ہیں اور حسن غیر سیاسی طریق کار کی۔ امام حسین نے وقت کے مسلم حکمراں سے ٹکرا کر جس سیاسی مقصد کو حاصل کرنا چاہا، اسی مقصد کو امام حسن نے ٹکراؤ کے میدان سے واپسی کے ذریعہ حاصل کیا۔ اگرچہ امام حسین کا کردار اتنا مشہور ہوا کہ ہر آدمی اس سے واقف ہو گیا، جب کہ امام حسن کے کردار سے، اس کی ساری عظمتوں کے باوجود، بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اور اس سے بھی کم وہ لوگ ہیں جو اس عظیم کردار کی اہمیت کو سمجھتے ہوں۔

امام حسین بن علی (۶۱-۴ھ) کی چھاپ بعد کی اسلامی تاریخ پر اتنی زیادہ ہے کہ آنجناب، اکثر علماء، اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی علامت بن گئے ہیں۔ مسلمان ہر سال جس دھوم سے "۱۰ محرم" کی یادگار مناتے ہیں، کسی بھی دوسرے دن کی یادگار اس طرح نہیں مناتے۔ حتیٰ کہ شاید "۱۲ ربیع الاول" کی بھی نہیں۔ عام خیال کے مطابق اسلام کی روح یہ ہے کہ آدمی ناحق کے آگے سر نہ جھکائے۔ خواہ اس راہ میں لڑ کر اس کو اپنی جان دے دینی پڑے۔ اسی کا نام، لوگوں کے نزدیک، شہادت ہے۔ یہ شہادت اپنی اعلیٰ ترین شکل میں امام حسین کی زندگی میں متشکل ہوئی ہے۔ آپ کے ساتھ، عام روایت کے مطابق، کل ۷۲ آدمی تھے۔ دوسری طرف آپ کے مقابلہ کے لئے چھ ہزار کا لشکر پورے ساز و سامان کے ساتھ موجود تھا۔ مگر آپ ظالم حکمراں کے آگے نہیں جھکے اور لڑ کر اپنی جان دے دی:

سر داد نہ داد دست در دست یزید

عجیب بات ہے کہ اسلامی تاریخ کی یہ سب سے زیادہ مشہور بات نہ اسلام کے مطابق ہے اور نہ خود تاریخی واقعات کے مطابق۔ اسلام اور تاریخ دونوں اس تصویر کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

واقعات کیا کہتے ہیں

اب دیکھئے کہ اصل تاریخی تصویر کیا ہے۔ مکہ میں قبیلہ قریش (بنو عبد مناف) کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ ایک بنو ہاشم۔ دوسرے بنو امیہ۔ ان دونوں میں قدیم زمانہ سے خاندانی رقابت چلی آرہی تھی۔ بنو ہاشم میں پیغمبر پیدا ہوئے تو ہاشمیوں میں تو صرف ایک شخص (عبد العزیٰ) آپ کا دشمن بنا۔ مگر اموی گھرانے کے لوگ عام طور پر آپ کے مخالف ہو گئے۔ تاہم ان کی مخالفت کامیاب نہ ہو سکی۔ فتح مکہ (۸ھ) کے بعد، عرب کے دوسرے قبائل کی طرح، بنو امیہ بھی اسلام میں داخل ہو گئے۔ عہد رسالت اور بعد کو خلافت راشدہ کے زمانہ میں ان کے لائق افراد نے مختلف اسلامی عہدے حاصل کئے۔ خلیفہ سوم عثمان بن عفان جو کہ اموی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے زمانہ (۲۳-۳۵ھ) میں بنو امیہ کا اثر و رسوخ کافی بڑھ گیا۔ اس کے بعد جب علی بن ابی طالب کا انتخاب ہوا، جو پہلے ہاشمی خلیفہ تھے، تو بنو امیہ کی رقابت

حائل تھی۔ خون عثمان کے مسئلہ نے ان کا ساتھ دیا اور انھوں نے خلیفہ چہارم کی بیعت میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ آپ کا پورا زمانہ خلافت (۳۵ - ۴۰ھ) باہمی خانہ جنگیوں میں گزرا۔ یہاں تک کہ آپ ایک جنونی مسلمان کے ہاتھ سے شہید کر دیئے گئے۔

علی بن ابی طالب کے بعد آپ کے صاحبزادہ حسن بن علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ صرف عراق اور خراسان (ایران) کی خلافت امام حسن کے حصہ میں آئی تھی۔ بقیہ تمام ممالک یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر وغیرہ معاویہ بن ابی سفیان اموی کے زیر قبضہ تھے جنھوں نے علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت نہیں کی تھی اور اب حسن کی خلافت کو تسلیم کرنے سے بھی انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ ربیع الاول ۴۱ھ میں صورت حال اس نوبت کو پہنچ گئی تھی کہ ایک طرف امام حسن کے ساتھ چالیس ہزار سے زیادہ مسلح افراد تھے جو موت پر بیعت کئے ہوئے تھے۔ دوسری طرف امیر معاویہ کے جھنڈے کے نیچے ساٹھ ہزار کا لشکر مرنے مارنے پر تیار تھا۔ امام حسن نے خیال کیا کہ میرے والد کی پانچ سالہ خلافت کے زمانہ میں مسلمان خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوتے رہے۔ اب اگر میں خلافت پر اصرار کرتا ہوں تو مزید اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ یہ باہمی قتل و خون مزید نا معلوم مدت تک جاری رہے گا۔ امام حسن اگرچہ حق پر تھے اور وہی ممالک اسلامی کے جائز خلیفہ تھے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ فریق ثانی بٹنے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ خود ہی میدان مقابلہ سے ہٹ گئے اور خلافت کا عہدہ امیر معاویہ کے حوالے کر دیا۔

اس کے بعد ۲۰ سال (۴۱ - ۶۰ھ) تک حالات پر سکون رہے۔ اسلامی قوتیں آپس کی جنگ کے بجائے اسلام کی سرحدوں کو وسیع کرنے میں لگ گئیں۔ امیر معاویہ کے انتقال (رجب ۶۰ھ) کے بعد خلافت کا مسئلہ دوبارہ زندہ ہوا۔ امام حسین جو اپنے بڑے بھائی کی دست برداری خلافت سے خوش نہ تھے، انھوں نے امیر معاویہ کے لڑکے یزید بن معاویہ (۶۰ - ۶۴ھ) کی خلافت کو ماننے سے اسی طرح انکار کر دیا جس طرح اس سے پہلے معاویہ بن ابی سفیان نے ان کے والد علی بن ابی طالب کی خلافت کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ یہیں سے امام حسین بن علی (۴ - ۶۱ھ) کا وہ کردار شروع ہوتا ہے جس کی یاد ہر سال ۱۰ محرم کو منائی جاتی ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یزید بن معاویہ نے دمشق کے تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد اپنے مدینہ کے والی عتبہ بن ابی سفیان کو لکھا کہ لوگوں سے میرے نام پر بیعت لو۔ ولید نے لوگوں کو جمع کیا تو امام حسین نے فوری طور پر بیعت ہونے سے معذوری ظاہر کی۔ اگلے روز وہ خاموشی کے ساتھ اپنے اہل و عیال کو لے کر مدینہ سے مکہ چلے گئے۔ تاہم مکہ بھی ان کے لئے سکون کی جگہ نہ بن سکا۔ کیونکہ مکہ کے لوگوں نے عبد اللہ بن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہ صورت حال امام حسین پر اس قدر گراں تھی کہ وہ اور ان کے اہل خاندان مکہ میں عبد اللہ بن زبیر کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جو عملاً اس وقت مکہ کے حاکم تھے۔

خون عثمان کے مسئلہ نے مکہ اور مدینہ کو خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کے لئے ناساعد بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے مدینہ کو چھوڑ کر کوفہ (عراق) کا قیام اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح اسلام کا دار الخلافہ ۳۶ھ میں مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔

امام حسن نے خلافت سے دست برداری (۴۱ھ) کے بعد کوفہ کا قیام ترک کر دیا اور اپنے سابق وطن (مدینہ) کی طرف لوٹ آئے۔ کوفیوں کی نفسیات کے بارے میں عرب شاعر فرزدق نے نہایت صحیح طور پر امام حسین سے کہا تھا: "اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر ان کی تلواریں آپ کی حمایت میں بے نیام نہیں ہو سکتیں" یزید کو جب خلافت کا عہدہ ملا تو اہل کوفہ کی محبت اہل بیت جوش میں آئی۔ انھوں نے امام حسین کو خطوط لکھنے شروع کئے کہ آپ کوفہ آ جائیں۔ ہم سب لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ اس قسم کے تقریباً ڈیڑھ سو خطوط کوفہ سے مکہ پہنچے۔

امام حسن صورت حال کی نزاکت کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی حسین کو وصیت کر دی تھی کہ تم کبھی کوفہ والوں کی باتوں سے فریب مت کھانا۔ میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ نبوت اور خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے تمھارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملہ میں خاموش رہو۔ مگر امام حسین کی حوصلہ مند طبیعت اس قسم کے کسی مشورہ پر راضی نہ ہو سکی تھی۔ انھوں نے کوفہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ انھوں نے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل بن ابی طالب کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم پہلے کوفہ جاؤ اور وہاں باقاعدہ طور پر میرے لئے بیعت لو۔ جلد ہی میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔ مسلم بن عقیل اس منصوبہ سے متفق نہ تھے۔ تاہم امام حسین کے اصرار پر وہ کوفہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

مسلم بن عقیل جب امام حسین کے نمائندہ کی حیثیت سے کوفہ پہنچے تو وہاں بہت سے لوگوں نے ان کی پذیرائی کی۔ کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۱۸ ہزار آدمی نیابۃً ان کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ یزید کو جب خبر ہوئی تو اس نے عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ والوں کی سرکوبی کے لئے مقرر کیا۔ عبید اللہ بن زیاد بصرہ سے کوفہ پہنچا اور لوگوں کو جمع کر کے انھیں سخت تنبیہ کی۔ اس کے بعد مسلم بن عقیل اور ان کے کوفی میزبان ہانی بن عروہ کو اپنے محل کی چھت پر کھڑا کر کے قتل کرا دیا۔ ان کے کٹے ہوئے سر اور خون آلود جسم ہوا میں لہراتے ہوئے لوگوں کے سامنے زمین پر گرے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ امام حسین کا ساتھ دینے سے پہلے لوگوں کو سوچ لینا چاہئے کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ تمام لوگ خاموش ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔

مکہ میں امام حسین ان تمام واقعات سے بے خبر رہ کر کوفہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، عمرو بن سعد بن العاص، عبد الرحمن بن حارث اور مکہ کے دوسرے بزرگوں نے امام حسین کو شدت سے منع کیا۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ آپ کوفہ جانے کے بجائے مکہ کی حکومت قبول فرمائیں۔ آپ ہاتھ بڑھائیں۔ میں سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب نے مدینہ سے خط لکھ کر با اصرار منع کیا۔ مگر انھوں نے نہیں مانا۔ حتی کہ انھوں نے عبد اللہ بن عباس کی اس آخری بات کو ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ عورتوں اور بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر سفر کریں یا کم از کم حج کے بعد روانہ ہوں جس میں صرف چند دن باقی رہ گئے ہیں۔

امام حسین ذی الحجہ ۶۰ھ کے پہلے ہفتہ میں کوفہ کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں عبد اللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے امام حسین سے کہا: "میں آپ کو قسم دلاتا ہوں کہ آپ مکہ واپس چلے جائیں۔ اگر آپ بنو امیہ سے خلافت چھیننے کی کوشش کریں گے تو وہ ضرور آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔ اور پھر ہر ایک ہاشمی، ہر ایک عرب اور ہر ایک مسلمان

کے قتل پر دلیر ہو جائیں گے۔ مگر امام حسین کی حوصلہ مند طبیعت کے لیے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔ یزید بن معاویہ اور اس کے والی عراق عبید اللہ بن زیاد کو سب خبریں مل رہی تھیں۔ انھوں نے چھ ہزار کی فوج مختلف مقامات پر لگا دی کہ آپ کو کوفہ میں داخل نہ ہونے دے۔ امام حسین کے ساتھ ابتداءً چند سو آدمی تھے۔ جب ان کو یزیدی فوج کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو لوگ چھٹنا شروع ہوئے یہاں تک کہ کربلا پہنچتے پہنچتے آپ کے قافلہ کی تعداد بہتر رہ گئی۔ صرف اپنے خاندان اور قبیلہ کے لوگ باقی رہ گئے۔

تاہم آخر وقت میں امام حسین کو صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ مسلم بن عقیل کے قتل، کوفیوں کی بے وفائی اور یزید کے لشکر جرار کے مقابلہ میں آپ کا مختصر قافلہ، ان چیزوں نے آپ کی کامیابی کے امکان کو ختم کر دیا تھا۔ آپ نے سمجھ لیا کہ تصادم کا واحد مطلب بے موت ہے۔ امام حسین ایک انتہائی شریف اور بہادر آدمی تھے۔ جنگ یا موت انھیں خوف زدہ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اپنے ساتھیوں نیز عورتوں اور بچوں کے لیے اپنے دل میں جذبۂ رحم کی پیدائش کو روکنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ آخر وقت میں وہ یزید سے صلح کرنے کے لیے راضی ہو گئے۔ انھوں نے یزید کے والی عبید اللہ بن زیاد کے سامنے تین تجویزیں پیش کیں:

۱۔ میں مکہ کو واپس چلا جاؤں اور وہاں خاموشی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مصروف ہو جاؤں۔

۲۔ مجھے کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو کہ وہاں کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔

۳۔ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔ ([illegible]، الطبری، جلد ۴، صفحہ ۳۱۳)

امام حسین کے رویہ میں اس تبدیلی سے یزید کی فوج کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ اگرچہ دونوں کربلا کے میدان میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے۔ اس کے باوجود "نواسۂ رسول" کے احترام کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف کے لوگ مل کر نمازیں ادا کرتے تھے اور اکثر حسین ہی لوگوں کے امام ہوتے تھے۔ عبید اللہ بن زیاد کے پاس امام حسین کا پیغام پہنچا تو وہ بھی بہت خوش ہوا کہ لڑائی بھڑائی کے بغیر مسئلہ ختم ہو جائے گا اور امام حسین یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ لیکن عبید اللہ بن زیاد کا ایک مشیر شمر ذی الجوشن، جو نہایت بری طبیعت کا آدمی تھا، اس نے عین وقت پر عبید اللہ بن زیاد کے ذہن کو پھیر دیا۔ اس نے سمجھایا کہ امام حسین کے مسئلہ کو آخری طور پر ختم کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ عبید اللہ بن زیاد کے حکم پر اس کی فوجوں نے امام حسین کے لیے لوٹنے کے تمام راستے بند کر دیے۔ وہ جس سمت سے بھی واپس ہونا چاہتے، ادھر ہی ایک فوج ان کا راستہ روکنے کے لیے موجود رہتی۔

۱۰ محرم ۶۱ھ کو یزیدی فوجوں کی طرف سے حملہ کا آغاز ہوا۔ امام حسین کے قافلہ نے نہایت بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ سارے لوگ کٹ گئے اور آخر میں، عورتوں اور بچوں کے علاوہ، صرف امام حسین بچ گئے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ یزیدی فوج کا ہر آدمی آپ پر وار کرنے سے بچتا تھا اور طرح دے جاتا تھا۔ آخر میں وہی شمر ذی الجوشن آگے بڑھا جس نے عبید اللہ بن زیاد کو آپ کے خلاف جنگ کے لیے اکسایا تھا۔ اس نے چند آدمیوں کو لے کر اس بہادر انسان پر قاتلانہ حملہ کیا اور آپ کا کام تمام کر دیا۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجیے کہ شمر ذی الجوشن، امام حسین کا چچا

گیا تھا اور عمرو بن سعد جس نے امام حسین کے قافلے کی طرف پہلا تیر پھینکا تھا، امام حسین کا ماموں۔

امام حسین کے معاملہ کی یہ تصویر جو طبری اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں ملتی ہے، وہ اس سے کافی مختلف ہے جو ہمارے شعراء اور مقررین و محررین پُرجوش الفاظ میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امام حسین کا سیاسی اقدام بڑی حد تک ذاتی حوصلہ کے تحت وجود میں آنے والا اقدام تھا۔ اس وقت جو صحابہ کرام زندہ تھے، وہ سب اس معاملہ میں آپ کے خلاف تھے۔ مکہ اور مدینہ کے بزرگ ان کو اس اقدام سے روک رہے تھے، حتیٰ کہ خود آپ کے اعزہ بھی آپ سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کی حوصلہ مند طبیعت کے لئے کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکی۔

تاہم آخری دنوں میں معاملہ کی نزاکت ان کی سمجھ میں آ گئی اور وہ ٹھیک اسی رائے پر پہنچ گئے جہاں ان کے بڑے بھائی امام حسن اپنی دوراندیشی سے ۲۰ سال قبل پہنچے تھے۔ یزید بن معاویہ جو اپنے دار الخلافہ دمشق (شام) میں مقیم تھا، اگر وہ خود کربلا (عراق) کے میدان میں اپنی فوجوں کے ساتھ موجود ہوتا اور حسین و یزید کے درمیان براہ راست گفتگو ہوتی تو اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ وہ امام حسین کی آخری شرط پر راضی ہو جاتا ——— یزید اس امام حسین کا دشمن تھا جو اس کا سیاسی حریف ہو۔ بیعت خلافت کے بعد امام حسین اس کے لئے "نواسۂ رسول" ہو گئے اور وہ ان کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے وطن کی طرف لوٹا دیتا۔ مگر یزید کو امام حسین کی مصالحانہ پیش کش کا علم صرف اس وقت ہوا جب کہ ان کا سر ان کے تن سے جدا کیا جا چکا تھا۔

سیاسی حریف کا مسئلہ

امام حسین نے مقابلہ کے آخری دن (۱۰ محرم ۶۱ھ) کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کے سامنے جو تقریر کی، وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے، دیگر باتوں کے علاوہ آپ نے فرمایا: "عیسیٰ کا گدھا بھی اگر باقی ہوتا تو تمام عیسائی قیامت تک اس کی پرورش کرتے۔ تم کیسے مسلمان اور کیسے امتی ہو کہ اپنے رسول کے نواسے کو قتل کرنا چاہتے ہو۔" دراصل "رسول کے گدھے" کا معاملہ ہوتا تو مسلمان بھی اس کو پوجتے۔ رسول کے نواسے کا احترام کرنے کے لئے وہ دل و جان سے تیار تھے۔ مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ رسول کا نواسہ (امام حسین) ان کا سیاسی حریف بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور سیاسی حریف کو کوئی بھی نہیں بخشتا، خواہ وہ عیسائی ہو یا مسلمان۔ وہی یزید جس نے ۶۱ھ میں امام حسین کے استیصال کے لئے ایک ظالم سردار (عبید اللہ بن زیاد) کو مقرر کیا، اسی نے ۶۳ھ میں مدینہ پر چڑھائی کے لئے مسلم بن عقبہ کو روانہ کیا تو اس کو تاکیدی حکم دیا کہ حسین کے صاحبزادے علی بن حسین بن علی (۳۸ - ۹۵ھ) کا پورا خیال رکھنا اور ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علی بن حسین (امام زین العابدین) حادثۂ کربلا کے بعد سیاست سے الگ ہو کر مدینہ کے نواح میں مقیم ہو گئے تھے۔ اہل مدینہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہا تو انھوں نے بیعت لینے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا: "میرے باپ اور دادا دونوں خلافت کے معاملہ میں اپنی جانیں کھو چکے ہیں۔ کیا میں بھی اس میں مشغول ہو کر اپنے کو قتل کرا دوں"۔ کربلا کی جنگ کے خاتمہ کے بعد امام حسین کے بچے ہوئے

اہل خاندان کے ساتھ یزید نے نہایت عزت و احترام کا برتاؤ کیا اور ان کو ہر طرح کی مدد دے کر مدینہ کی طرف واپس بھیجا۔

یزید نے حسین بن علی اور عبد اللہ بن زبیر وغیرہ سے بیعت لینے کے لیے جنگ کی۔ مگر عبد اللہ بن عمر سے اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس نے مدینہ میں اپنے عامل ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو لکھا کہ عبد اللہ بن عمر بیعت نہ کریں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو معلوم تھا کہ عبد اللہ بن عمر ایک عابد و زاہد آدمی ہیں۔ ان کے اندر کوئی سیاسی حوصلہ نہیں ہے۔

یزید کے والد معاویہ بن ابی سفیان نے اپنی سیاست کا اصول ایک جملہ میں اس طرح بتایا تھا:

انّا لا نحول بین الناس وبین ألسنتهم ما لم یحولوا بیننا وبین سلطاننا

ہم لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں۔

(ابن اثیر، تاریخ کامل، جلد ۴، صفحہ ۵)

یزید کو بھی یہی اصول سیاست، اگر کلی طور پر نہیں تو بڑی حد تک، وراثۃً ملا تھا۔ حادثہ کربلا کا ردعمل مدینہ پر یہ ہوا کہ لوگ یزید کی حکومت کے باغی ہو گئے۔ یزید کے ہم قبیلہ (بنو امیہ) اس وقت مدینہ میں تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں آباد تھے۔ ان کو گھیر لیا اور پریشان کرنا شروع کر دیا۔ بنو امیہ نے ایک قاصد کے ذریعہ یزید کو مطلع کیا۔ قاصد نے جب دمشق پہنچ کر یزید کو صورت حال کی خبر دی تو اس نے یہ شعر پڑھا:

لقد بدّلوا الحلم الذی فی سجیتی　　فبدّلتُ قومی غلظۃً بلیان

میری بردباری جو میری فطرت تھی لوگوں نے اس کو بدل دیا۔ اس لیے میں نے اپنی قوم کے ساتھ نرمی کے بجائے سختی اختیار کر لی (طبری)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام حسین اگر یزید بن معاویہ کے سیاسی حریف نہ بنتے تو آپ کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہوتا۔

امام حسن کا کردار

یزید کے مقابلہ میں جو صورت حال امام حسین کی زندگی میں پیش آئی وہی اس سے زیادہ شدید شکل میں آپ کے بڑے بھائی امام حسن (م ۵۰ھ) کی زندگی میں معاویہ کے مقابلہ میں پیش آ چکی تھی۔ مگر آپ نے اس سے بالکل مختلف ردعمل کا اظہار کیا جس کا نمونہ ہم کو امام حسین کی زندگی میں ملتا ہے۔ یہاں یہ یاد دلانا مناسب ہوگا کہ حدیث کی کتابوں میں مناقب کے ذیل میں حسنین کے بارے میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ تاہم دونوں بھائیوں میں ایک فرق ہے۔ امام حسین کے بارے میں جو مجموعی روایات ہیں ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کے لیے زیادہ تر محبت کا ذکر ہے جو نواسہ ہونے کی حیثیت سے آپ کے لیے بالکل فطری تھی۔ مثال کے طور پر اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا:

هذان ابنای وابنا ابنتی، اللّٰهم انی احبّهما فاحبّهما

(رواہ الترمذی واسنادہ حسن)

یہ دونوں (حسن و حسین) میرے لڑکے ہیں اور میری لڑکی کے لڑکے ہیں۔ خدایا میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر۔

دوسری طرف امام حسن کے بارے میں جو روایات ہیں، وہ نہ صرف سنداً زیادہ قوی ہیں، بلکہ حجت فطری سے آگے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً انس بن مالک بتاتے ہیں:

لم یکن احدٌ اشبهَ بالنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الحسن بن علی (رواہ البخاری)

حسن بن علی سے زیادہ کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ نہ تھا۔

صوری اور شکلی مشابہت کے علاوہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ صحیح روایات میں امام حسین کے لئے کسی تاریخی کردار کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جب کہ دوسری طرف یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسن کے بارے میں ایک عظیم کردار ادا کرنے کی پیشین گوئی فرمائی تھی:

عن ابی بکرۃ، قال: رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی المنبر والحسنُ ابن علی الی جنبہ وھو یُقبل علی الناس مرۃً وعلیہ اُخری۔ ویقول: انّ ابنی ھذا سیدٌ، ولعلّ اللّٰہ ان یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین (رواہ البخاری)

ابوبکرہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر دیکھا ہے حسن بن علی آپ کے پہلو میں تھے۔ آپ ایک بار لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، دوسری بار ان کی طرف۔ اور فرماتے تھے: یہ میرا لڑکا سردار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرا دے۔

رسول کی یہ پیشین گوئی امام حسن کی زندگی میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ آپ کی بیعت ۴۰ھ میں اس حال میں ہوئی کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لوگ بنو امیہ کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے۔ کچھ بنو ہاشم کے۔ دونوں میں سے کوئی نہ دوسرے کو ختم کر سکتا تھا نہ ہار ماننے کے لئے تیار تھا۔ آپ نے بیعت لی تو آپ نے لوگوں سے یہ اقرار بھی لیا: "میں جس سے جنگ کروں تم اس سے جنگ کرو گے، میں جس سے صلح کروں تم اس سے صلح کرو گے"۔
حضرت علی کی شہادت کے بعد آنجناب کے صاحبزادہ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہونا بنو امیہ کے قائد معاویہ بن ابی سفیان کے لئے نئے چیلنج کے ہم معنی تھا۔ وہ اپنے دارالسلطنت دمشق سے ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر کوفہ کی جانب روانہ ہوئے جہاں حسن بن علی مقیم تھے۔ امام حسن کوفہ سے نکلے تو آپ کے ساتھ بھی تقریباً اتنی ہی فوجی طاقت تھی۔ ایک مشاہد کے الفاظ میں پہاڑ جیسے لشکر (کتائب امثال الجبال) آپ کے ساتھ تھے۔ یہ لوگ آپ کے والد علی بن ابی طالب کے ہاتھ پر موت کی بیعت کر چکے تھے۔ اور لڑنے مرنے سے کم کسی چیز پر راضی نہ تھے۔

دونوں طرف کے لشکر مدائن کے قریب جمع ہوئے۔ معاویہ بن ابی سفیان نے امام حسن کے نام پیغام بھیجا کہ جنگ سے بہتر صلح ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ مجھ کو خلیفہ تسلیم کر کے میرے ہاتھ پر بیعت ہو جائیں۔ امام حسن نے غور و فکر کے بعد اس پیش کش کو منظور کر لیا۔ چھ ماہ خلیفہ رہ کر ۴۱ھ میں امیر معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور خلافت ان کے سپرد کر دی۔
۔۔ حسن کے پرجوش حامیوں کے لئے یہ "ذلت" ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس فیصلہ کے خلاف

ف یہ روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ مختلف طرق سے نقل ہوئی ہے۔ مثلاً ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں
ان ابنی ھذا سیدٌ وحسبی باللّٰہ ان یبقیہ حتی یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین

بہت شور و غل کیا۔ آپ کو عار المسلمین (مسلمانوں کے لیے ننگ) اور مذل المومنین (مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے) کا خطاب دیا۔ حتی کہ آپ کو کافر بتایا، آپ کے کپڑے نوچے، آپ پر تلوار سے حملہ کیا۔ مگر آپ کسی بھی حال میں مقابلہ آرائی کی سیاست اختیار کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ آپ نے فرمایا:

"خلافت اگر معاویہ کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا، اگر میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا"

صلح کے بعد امیر معاویہ نے امام حسن کے لئے ایک لاکھ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ (حافظ ذہبی، العبر جلد ۱ صفحہ ۴۹)

ایک شخص کے پیچھے ہٹ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اجتماعیت میں تبدیل ہو گیا۔ ۴۱ ھ جو اسلامی تاریخ میں، صفین و جمل کے بعد، تیسری سب سے بڑی باہمی خوں ریزی کا عنوان بنتا، عام الجماعت کے نام سے پکارا گیا۔ وہ اختلاف کے بجائے اتحاد کا سال بن گیا۔ مسلمانوں کی قوت جو آپس کی لڑائیوں میں برباد ہو رہی تھی، اسلام کی اشاعت و توسیع میں صرف ہونے لگی ——— پیچھے ہٹنا سب سے بڑی بہادری ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس بہادری کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔

پیغمبر اسلام کی وفات (۱۱ ھ) کے بعد ۲۰ سال تک اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ ہر مہینے کسی نہ کسی بڑے علاقہ کی فتح کی خبر آتی تھی۔ مگر تیسرے خلیفہ کے آخری زمانہ میں جو باہمی لڑائیاں شروع ہوئیں، انھوں نے تقریباً ۱۰ سال تک فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس بند دروازہ کو جس شخص نے دوبارہ کھولا وہ امام حسن ہی تھے۔ ۴۱ ھ میں آپ کی خلافت سے دست برداری بظاہر میدان عمل سے واپسی کا ایک فیصلہ تھا۔ مگر حقیقۃً یہ زیادہ بہتر طور پر میدان عمل کی طرف جانا تھا۔ یہ مسلمانوں کی قوت کو باہمی مقابلہ آرائی سے ہٹا کر خارجی میدان میں جد و جہد کی طرف موڑ دینا تھا۔ اس واپسی نے اسلام کی تاریخ میں کامیابی کے نئے امکانات کھول دیے۔ امام حسن اگر خلافت پر اصرار کرتے تو عجب نہیں کہ اسلامی تاریخ پہلی صدی ہجری ہی میں ختم ہو جاتی۔ مسلمان آپس میں لڑ لڑ کر برباد ہوتے رہتے اور قیاصرہ و اکاسرہ اور یہود و منافقین دوبارہ زندہ ہو کر ہمیشہ کے لئے اسلام کا استیصال کر دیتے۔ تاریخ اسلام کے ہیرو کا انتخاب اگر حسنین میں سے کسی کے لئے کرنا ہو تو بلاشبہ وہ امام حسن ہوں گے۔

پیغمبر کی ہدایات

امام حسن کا یہ مسلک کوئی اتفاقی یا طبعی چیز نہ تھا۔ وہ شریعت کی واضح تعلیمات پر مبنی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے بتا دیا تھا کہ آپ کے بعد مسلمانوں کی سیاست میں بگاڑ آنے والا ہے۔ چنانچہ آپ نے انتہائی واضح لفظوں میں حکم دیا تھا کہ "اصلاح" کے نام پر تم لوگ آپس میں مار دھاڑ مت کرنا بلکہ اپنی ذاتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں مصروف رہنا۔ حدیث کی کتابوں میں کتاب الفتن کے تحت کثرت سے اس قسم کی روایتیں موجود ہیں۔

حضرت حذیفہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگ "خیر" کی بابت پوچھتے تھے۔ میں آپ سے "شر" کی بابت سوال کرتا تھا، اس اندیشہ سے کہ کہیں میں اس میں مبتلا ہو جاؤں۔ میں نے پوچھا، ہم جاہلیت اور شر میں تھے پھر

اللہ نے ہم کو خیر دیا کیا اس خیر کے بعد پھر شر ہے (فهل بعد هذا الخير من شر) آپ نے فرمایا ہاں:

يكون بعدي أئمة لا يهتدون بهداي ولا يستنون بسنتي، وسيقوم فيهم رجال قلوبهم قلوب الشياطين في جثمان إنس۔ قال حذيفة قلت: كيف أصنع يا رسول الله إن أدركت ذلك۔ قال تسمع وتطيع للأمير وإن ضرب ظهرك وأخذ مالك، فاسمع وأطع (رواه مسلم)

میرے بعد ایسے امیر ہوں گے جو میری ہدایت کو نہیں اختیار کریں گے اور میری سنت پر نہیں چلیں گے۔ ان میں ایسے لوگ اٹھیں گے جو بظاہر انسان ہوں گے مگر ان کے جسم کے اندر شیطانی دل ہوں گے۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا اے خدا کے رسول اگر میں اس زمانہ کو پاؤں تو کیا کروں۔ آپ نے فرمایا۔ امیر کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ خواہ تمھاری پیٹھ پر مارا جائے اور تمھارا مال چھینا جائے۔ ہر حال میں سن اور اطاعت کر

ایک اور روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں: فإلا فمت وأنت عاض على جذل شجرة (ورنہ مر جاؤ اس حال میں کہ تم درخت کے ٹھنٹھ سے چپٹے ہوئے تھا ہو)

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ويل للعرب من شر قد اقترب، أفلح من كف يده (رواه أبو داؤد)

خرابی ہے عرب کی اس شر سے جو قریب آ لگا۔ اس میں وہ شخص کامیاب رہے گا جس نے اپنے ہاتھ کو روکا۔

ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے فتنہ سے ڈرایا۔ لوگوں نے پوچھا ہم کو آپ کیا حکم دیتے ہیں۔ (فما تأمرنا)۔ آپ نے فرمایا:

كسروا فيها قسيكم وقطعوا فيها أوتاركم واضربوا سيوفكم بالحجارة، والزموا فيها أجواف بيوتكم۔ فإن دخل على أحد منكم فليكن كخير ابني آدم (رواه أبو داؤد)

اس میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالو۔ اپنی تانت کو کاٹ ڈالو۔ اپنی تلواروں کو پتھر پر پٹک دو۔ اور اپنے گھروں کے اندر بیٹھ رہو۔ اگر کوئی تم کو مارنے کے لیے تمھارے گھر میں گھس آئے تو تم آدم کے دو لڑکوں میں سے بہتر لڑکے بنو۔ (قتل ہو جاؤ گر قتل نہ کرو)

یہی ہدایت تھی جس پر خلیفہ سوم عثمان بن عفان نے عمل کیا۔ آپ محرم ۲۴ھ میں خلیفہ منتخب ہوئے اور ذی الحجہ ۳۵ھ میں مسلمان بلوائیوں نے آپ کو شہید کر دیا جب کہ آپ کی عمر ۸۲ سال تھی۔ اس وقت مدینہ کے وفادار مسلمانوں کی ایک جماعت آپ کے مکان پر موجود تھی اور بلوائیوں کو روکنے کے لیے لڑنے مرنے پر تیار تھی۔ مگر خلیفہ سوم نے ان کو قسم دلا کر اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ کرنے سے روکا۔ آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتے رہے، یہاں تک

۱؎ افضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر کی قسم کی جو روایات کتب حدیث میں آئی ہیں، ان سے مراد انفرادی نصیحت ہے۔ اس کا بھی بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو تنہائی میں کیا جائے (سئل ابن عباس عن أمر السلطان بالمعروف ونهيه عن المنكر فقال: إن كنت فاعلا ولا بد ففيما بينك وبينه۔ جامع العلوم والحكم صفحہ [illegible])——مسلح حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی تحریک چلانے کا معاملہ اس سے بالکل الگ ہے اور حدیث میں اس کو صریح طور پر منع کیا گیا ہے

کہ لوگوں نے تلواروں اور نیزوں سے آپ کو قتل کر دیا۔

خلیفہ سوم کا اس طرح خاموشی سے قتل ہو جانا اتفاقی نہیں بلکہ ارادۃً تھا۔ یہ دراصل شریعت کے حکم کی تعمیل تھی۔ شریعت کے مطابق، اپنی طرف سے جارحیت کا آغاز بندۂ مومن کے لئے کسی حال میں جائز نہیں۔ مسلمان دعوت و نصیحت کی راہ سے عمل کرتا ہے نہ کہ قتال کی راہ سے۔ اس کے بعد اگر دوسروں کی طرف سے جارحیت کا آغاز ہو تو دو صورتیں ہیں۔ جارحیت کا آغاز اگر کفار کی طرف سے ہو تو مخصوص شرائط کے تحت اس کے دفاع کا حکم ہے (بقرہ — ۱۹۰) لیکن جارحیت کا آغاز اگر مسلمان کی طرف سے کیا گیا ہو تو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ دفاع کے طور پر بھی اپنے دینی بھائی پر وار نہ کیا جائے:

لَئِنْ بَسَطتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ مائدہ — ۲۸	اگر تو نے مجھے مارنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں تجھ کو مارنے کے لئے اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔

خلیفہ سوم نے اسی دوسرے حکم پر عمل کرتے ہوئے اپنے مسلمان حملہ آوروں سے کوئی مقابلہ نہیں کیا اور خاموشی سے شہید ہو گئے۔ وہ آدم کے دو بیٹوں میں سے بہتر بیٹے بن گئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جس خلیفہ نے اصول شریعت کی اتنی بڑی عملی مثال قائم کی تھی، اس کے خون کا انتقام لینے کے لئے آپ کے بعد مسلمان پانچ سال (۳۵ — ۴۰ ھ) تک باہم لڑتے رہے۔ ایک خون عثمان کے نام پر ایک لاکھ مسلمانوں کو خود مسلمانوں کی تلواروں نے ذبح کر دیا۔ اس قتل و خون کے باوجود قاتلین عثمان کا مسئلہ خلفاء کے یہاں فیصل ہونے کے لئے باقی رہ گیا۔

انفرادی لڑائی سے کہیں زیادہ بری وہ لڑائی ہے جو ایک قائم شدہ مسلم حکومت کے خلاف کی جائے۔ اس قسم کا عمل دنیا و آخرت کی بربادی ہے۔ آنحضرت ؐ کو اندازہ تھا کہ اصلاح سیاست کا جذبہ لوگوں کو اپنے حکمرانوں کے خلاف ابھارے گا۔ آپ نے لوگوں کو پیشگی طور پر منع فرما دیا کہ اس قسم کی تحریک ہرگز نہ اٹھائیں۔ اپنے حکمرانوں کے ساتھ معرکہ آرائی کرنے کے بجائے ان کو نصیحت کریں۔ اس سے بھی اصلاح نہ ہو تو خاموشی اختیار کریں اور ان کے حق میں اللہ سے دعا مانگنے پر قناعت کریں۔ اس تاکید کی وجہ یہ تھی کہ ایک قائم شدہ حکومت کے خلاف حق کا جھنڈا لے کر کھڑا ہونا فساد میں مزید اضافہ کے سوا کسی اور نتیجہ تک نہیں پہنچاتا:

عَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِتِ النَّاسَ، ثُمَّ قَالَ: لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ (متفق علیہ)	حضرت جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے دن مجھ سے فرمایا: لوگوں کو چپ رکھو۔ پھر فرمایا: میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

انھیں ہدایات کا نتیجہ تھا کہ جنگ صفین (۳۷ ھ) کے وقت اصحاب رسول دسیوں ہزار کی تعداد میں موجود تھے۔ مگر مسلمانوں کی اس باہمی لڑائی میں عملاً شریک ہونے والے اصحاب کی تعداد بمشکل ۳۰ تھی (ابن تیمیہ، منہاج السنۃ، جلد ۳، صفحہ [illegible])

حدیث کی کتابوں میں فتنہ کے ابواب کے تحت کثرت سے ایسی روایتیں ہیں جو اس کو غیر مشتبہ طور پر واضح کر رہی ہیں۔ انھیں واضح ہدایات کی بنا پر بعد کو فقہ میں یہ مسئلہ بنا کہ سلطان متغلب کے خلاف خروج (بغاوت) جائز نہیں۔

کیونکہ اس سے امت میں انتشار اور باہمی قتل و خون وجود میں آتا ہے۔
یہاں اس سلسلے میں چند مزید روایتیں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں۔

عن عوف بن مالک رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول خیار ائمتکم الذین تحبونہم ویحبونکم، وتصلون علیہم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونہم ویبغضونکم، وتلعنونہم ویلعنونکم قال قلنا یا رسول اللہ افلا ننابذہم قال لا ما اقاموا فیکم الصلاۃ (رواہ مسلم)

عوف بن مالک کہتے ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے، تمہارے بہترامیر وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں۔ تم ان کے لئے دعا کرو، وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ اس کے برعکس تمہارے برے امیر وہ ہیں کہ تم ان سے بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں۔ تم ان پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔ ہم نے عرض کیا اے خدا کے رسول، ہم ان سے کیوں نہ لڑیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں۔

عن ابی ھنیدۃ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ قال سأل سلمۃ بن یزید الجعفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا نبی اللہ أرأیت ان قامت علینا امراء یسألونا حقہم ویمنعونا حقنا فما تأمرنا، فاعرض عنہ. ثم سألہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسمعوا واطیعوا فانما علیہم ما حملوا وعلیکم ما حملتم (رواہ مسلم)

وائل بن حجر کہتے ہیں کہ سلمہ بن یزید نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے خدا کے رسول، اگر ہمارے حاکم ایسے ہوں جو اپنا حق مانگیں اور ہمارا حق نہ دیں تو آپ ہم کو کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ نے منہ پھیر لیا۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا سنو اور اطاعت کرو۔ جو وہ کریں گے اس کے وہ ذمہ دار ہوں گے، جو تم کرو گے اس کے تم ذمہ دار ہو گے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کرہ من امیرہ شیئا فلیصبر فانہ من خرج من السلطان شبرا مات میتۃ جاہلیۃ (متفق علیہ)

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو اپنے امیر کی کوئی بات ناپسند ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ صبر کرے۔ اگر وہ اس کی اطاعت سے ایک بالشت بھی نکلا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ ؎

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہا ستکون بعدی أثرۃ وامور تنکرونہا، قالوا یا رسول اللہ کیف

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے بعد خود غرضی و بے انصافی ہوگی اور ایسی باتیں ہوں گی جن کو تم ناپسند کرو گے۔ لوگوں نے پوچھا اے خدا کے رسول، پھر آپ

؎ من خرج من السلطان شبرا مات میتۃ جاہلیۃ، من شذ شذ فی النار وغیرہ روایات کا تعلق سیاسی شذوذ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے اندر جو سیاسی نظام بالفعل قائم ہو اس کی اطاعت لازم ہے۔ اس سے سیاسی علیحدگی جائز نہیں۔ کیونکہ اس قسم کی علیحدگی، خواہ وہ اصلاح کے عذر سے ہو، صرف بگاڑ میں اضافہ کرتی ہے اور امت مسلمہ کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔

وأمور تنكرونها قال: تؤدون الحق الذي عليكم وتسألون الله الذي لكم (متفق عليه)

پھر آپ کیا حکم دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا، تمھارے اوپر جو حق ہے اس کو ادا کرو، اور تمھارا جو حق ہے اس کو خدا سے مانگو۔

عن أبي سعيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يوشك أن يكون خير مال المسلم غنم يتبع بها شعف الجبال ومواقع القطر، يفر بدينه من الفتن (رواه البخاري)

ابو سعید رض سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عنقریب مسلمان کا سب سے اچھا سرمایہ بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑوں کے اوپر اور بارش کی جگہوں پر چلا جائے۔ (سیاسی) فتنوں کی وجہ سے وہ اپنے دین کو لے کر بھاگے گا۔

پیغمبر اسلام کا یہ ارشاد کہ تمھارے حکمراں جب تک تم کو نماز پڑھنے دیں، ان سے مت لڑو، اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ ان سے کبھی نہ لڑو۔ کیونکہ ایسا کوئی بھی مسلم حکمراں نہیں ہو سکتا جس سے لوگ "نماز" پر راضی ہو جائیں، پھر بھی وہ ان کی مسجدوں کو ڈھائے اور ان کو رکوع و سجدہ نہ کرنے دے ——— تمام مسلم حکمراں جن کو ہم نے "ظالم" کے کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے، وہ اسی وقت ظالم ہے جبکہ ان کے اقتدار کو چیلنج کیا گیا۔ اور "ظلم" کی یہ قسم اتنی عام ہے کہ ہر صاحب امر کے یہاں پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ سیاسی ادارہ کے ہوں یا غیر سیاسی ادارہ کے۔

دوسری بات یہ کہ اس حدیث کا مطلب امت کو "ظالم حکمرانوں کی بے زبان رعیت" بنانا نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ بڑے اور بہتر کام کا راستہ دکھانا ہے۔ یہ امت کے افراد میں منفی ذہنیت کے بجائے مثبت ذہنیت کی پرورش کرتی ہے، ان کی کوششوں کو تخریب سے ہٹا کر تعمیر کی طرف لگاتی ہے۔ یہ اس عظیم حقیقت کی نشان دہی ہے کہ زندگی میں براہ راست اقدام سے کہیں زیادہ نتیجہ خیز وہ کام ہیں جو بالواسطہ میدانوں میں کئے جاتے ہیں۔ جو اگرچہ ظاہری دھوم دھام سے خالی ہوتے ہیں، تاہم وہ اتنے موثر ہوتے ہیں کہ بالآخر حریف کو اس زمین ہی سے محروم کر دیتے ہیں جس پر وہ کھڑا ہوا ہے۔ اللہ سے دعا کرنا، ایک دوسرے کے لئے محبت اور خیر خواہی کی فضا پیدا کرنا، دوسروں کے خلاف تحریک اٹھانے کے بجائے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے پر توجہ دینا، اپنی حق تلفی پر قانع رہ کر دوسروں کے حقوق ادا کرنا، سیاسی محاذ آرائی کا طریقہ چھوڑ کر خاموش تبلیغ کے ذریعہ انسانی فطرت کو جگانا، برسر اقتدار افراد سے ٹکرانے کے بجائے عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرنا، اپنے عملی دائرہ میں اپنی تعمیری کوششوں کو جاری رکھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو اپنے اندر انتہائی تعمیری امکانات رکھتی ہیں۔ اور اگر کوئی گروہ صحیح طور پر ان کو اختیار کرے تو کوئی چیز اس کو کامیابی تک پہنچنے سے روک نہیں سکتی۔

سیاسی منازعت بے فائدہ

پہلی صدی ہجری کا تجربہ آخری طور پر ثابت کر چکا ہے کہ قائم شدہ سیاسی نظام کے خلاف محاذ بنانا، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ ہو، صرف بگاڑ میں اضافہ کرتا ہے۔ بلکہ نئے نئے مسئلے پیدا کر کے معاملہ کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ ریاست عثمانی کی اصلاح کی تحریک نے قبیلہ قریش کی دو شاخوں، بنو امیہ اور بنو ہاشم کے قدیم خاندانی جھگڑے

کوئی شدید تر شکل میں زندہ کر دیا۔ اس سے نو مسلم یہودی عبداللہ بن سبا کو بڑی موافق زمین ملی جس سے فائدہ اٹھا کر اس نے "وصی" کا عقیدہ ایجاد کیا اور استحقاقِ خلافت کے سیاسی مسئلہ کو اعتقاد کا مسئلہ بنا ڈالا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دائمی طور پر دو متحارب فرقوں (شیعہ اور سنی) میں تقسیم ہو گئے۔ دبی ہوئی عصبیتوں کو موقع ملا کہ وہ "نظریاتی" مفروضوں کے سایہ میں ایک دوسرے کے خلاف اٹھ سکیں۔ عربی لوگ، جو عجمیوں کو حقیر سمجھتے تھے، امیر معاویہ کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہو گئے۔ عجمی لوگ، جو عرب اقتدار سے متنفر تھے، علی بن ابی طالب کے لشکر میں جمع ہو گئے۔
اصلاح سیاست کی تحریک صرف فساد سیاست پر منتج ہوئی۔ اس نے سارے ممالک اسلامی میں نازکی پیدا کر کے خلیفہ سوم کو شہید کر دیا۔ مگر صرف آپ کے قتل پر معاملہ ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اب عمل اور ردعمل کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو امیر معاویہ کی خلافت کے ایک عارضی وقفہ (۴۰ ـ ۶۰ھ) کو چھوڑ کر سیکڑوں برس تک جاری رہا۔ لاکھوں قیمتی جانیں انتہائی بے دردی کے ساتھ ہلاک کر دی گئیں۔ اور اصل مسئلہ اختلاف میں بلاکی اصلاح یا خونِ عثمان کا قصاص پھر بھی وہیں حل ہونے کے لئے باقی رہ گیا جہاں تمام مسائل کو بالآخر حل ہونا ہے۔
یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ حکومت کے لئے جو جنگ شروع کی جائے، اس کا خاتمہ نہ کامیابی پر ہوتا ہے اور نہ ناکامی پر۔ جماعت الف اور جماعت ب کی جنگ ختم ہوگی تو خود اس جماعت میں دو گروہ ہو جائیں گے جو جیت کر اوپر آئی ہے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ میں حصولِ خلافت کی جنگ ۳۵ھ میں شروع ہوئی اور تقریباً ایک سو سال تک مختلف شکلوں میں جاری رہی۔ اس پوری مدت میں بنو امیہ کا اقتدار قائم رہا۔ ۱۳۲ھ میں بنو ہاشم (بنو عباس) ایرانیوں کی مدد سے بنو امیہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر اب بنو ہاشم، عباسیوں اور علویوں میں تقسیم ہو کر خود ہی ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگے۔ محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ بن حسن بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب جو محمد مہدی نفس ذکیہ (م ۱۴۵ھ) کے نام سے مشہور ہوئے، عباسی خلیفہ ابو جعفر عبداللہ منصور بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب کے سیاسی حریف تھے۔ انھوں نے اپنے حامیوں کی مدد سے ابو جعفر منصور (۱۳۶ ـ ۱۵۸ھ) کے خلاف "صدائے نظام" کی تحریک چلائی۔ اس مقابلہ میں منصور کامیاب ہوا اور اس نے علویوں کو کچل ڈالا۔ یہ دونوں ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ابو طالب بن عبدالمطلب کی اولاد تھا دوسرا عباس بن عبدالمطلب کی اولاد۔ جب تک بنو امیہ کو اقتدار سے ہٹانے کا سوال تھا دونوں متحدہ سیاسی محاذ بنائے ہوئے تھے۔ مگر جب حکومت بدل گئی تو دونوں ایک دوسرے کے رقیب بن گئے۔ یہ رقابت اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک ایک نے دوسرے کو پیس نہ ڈالا۔
شہادتِ عثمان کے بعد اولاً ام المومنین عائشہ (م ۵۸ھ) قاتلینِ عثمان کو سزا دینے کا مطالبہ لے کر اٹھیں۔ زبیر بن العوام، طلحہ بن عبیداللہ اور دوسرے بہت سے لوگ ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو دو متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ عائشہ کے جھنڈے کے نیچے ۳۰ ہزار آدمی تھے اور علی بن ابی طالب کے ساتھ ۲۰ ہزار۔ بصرہ کے قریب مقابلہ ہوا جو جنگ جمل (۳۶ھ) کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقابلہ میں ۱۰ ہزار مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ذبح ہو گئے۔ طلحہ اور زبیر جنگ سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں ختم ہو گئے۔ طلحہ زخم کے سبب سے۔ اور زبیر کو

مقام وادی السباع میں ایک شخص نے حالت نماز میں مار ڈالا۔

اس کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ معاویہ بن ابی سفیان، جو اس وقت شام کے والی تھے، انھوں نے اس تحریک کا جھنڈا سنبھال لیا۔ علی بن ابی طالب کی طرف سے مطالبہ بیعت تھا۔ معاویہ بن ابی سفیان کی طرف سے مطالبہ قصاص۔ دونوں میں شام میں صفین کے مقام پر شدید تر مقابلہ (۳۷ھ) ہوا۔ تقریباً ۷۰ ہزار مسلمانوں کی گردنیں خود مسلمانوں کے ہاتھوں کاٹ ڈالی گئیں۔ اس عظیم ہلاکت کے باوجود مسئلہ حل نہ ہوا تو تحکیم (دو حکم) کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ تاہم اصل مسئلہ دوبارہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ البتہ عمرو بن العاص نے اس موقع پر جو کردار ادا کیا اس کی وجہ سے مزید نقصان یہ ہوا کہ جان کے قتل کے ساتھ اعتماد کے قتل کی روایات بھی مسلم معاشرہ میں قائم ہو گئیں۔ یہی بے اعتمادی کی فضا تھی جس نے خارجی فرقہ کو پیدا کیا۔ جس نے مقام نہروان (۳۸ھ) پر علی بن ابی طالب سے مقابلہ کیا اور تقریباً ۱۰ ہزار مسلمان مارے گئے۔ ان کی بے اعتمادی یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے امیر معاویہ، عمرو بن العاص اور علی بن ابی طالب کو یکساں طور پر گردن زدنی قرار دے دیا۔ ؎

خون عثمان کے نام پر پانچ سال (۳۵ھ — ۴۰ھ) کی خانہ جنگی اور بے حساب نقصانات کے بعد عملاً جو ہوا وہ یہ کہ امیر معاویہ کی سیاست مستحکم ہو گئی۔ بیشتر مسلم ممالک یمن، حجاز، شام، فلسطین، مصر سب امیر معاویہ کے زیر حکم آگئے۔ علی بن ابی طالب کی حکومت عراق اور ایران تک محدود ہو گئی۔ علی بن ابی طالب کی شہادت (۴۰ھ) کے بعد امام حسن کی خلافت سے دست برداری نے ان کی مزید مدد کی اور ۲۰ سال (۴۰ — ۶۰ھ) تک وہ پوری اسلامی دنیا پر بلا نزاع حکومت کرتے رہے۔

امیر معاویہ کے بعد مسئلہ دوبارہ جاگ اٹھا۔ امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا تھا۔ اس کی مخالفت

؎ صحابہ کے باہمی اختلافات کو آج کل کے لوگوں کے اختلافات پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بہت اونچے لوگ تھے۔ ان کا اختلاف تھا جو اختلاف کے وقت بھی اپنی اونچائی کو باقی رکھتے ہیں۔

اسحٰق بن راہویہ اپنی مسند سے روایت کرتے ہیں

سمع علی یوم الجمل او یوم الصفین رجلا یغلو فی القول فقال لا تقولوا الا خیرا۔ انما هم قوم زعموا انا بغینا علیهم وزعمنا انهم بغوا علینا فقاتلناهم

ابن تیمیہ، منہاج السنہ، جلد ۳، صفحہ ۶۰

علی نے جنگ جمل و صفین کے بارے میں ایک شخص کو سنا کہ وہ غلو آمیز باتیں کر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خیر کے سوا اور کچھ نہ کہو۔ دراصل انھوں نے یہ سمجھا ہے کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے۔ اس بنا پر ہم ان سے لڑے ہیں۔

زبیر بن العوام جنگ جمل میں حضرت علی کے مخالف تھے۔ جنگ میں حضرت علی کو فتح ہوئی۔ حضرت زبیر اپنے گھوڑے کا منہ پھیر کر چل دیے۔ بصرہ کے ایک شخص نے ان کا پیچھا کیا اور وادی السباع میں ان کو حالت نماز میں مار ڈالا۔ اس کے بعد وہ حضرت علی کے پاس ان کی تلوار لے کر پہنچا اور وہاں سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ وہ سمجھتا تھا کہ علی اپنے حریف کے قتل کی خبر سن کر خوش ہوں گے اور اس کو انعام دیں گے۔ مگر آپ نے فرمایا: ابن صفیہ (زبیر) کے قاتل کو دوزخ کی خوشخبری سنا دو۔

کے لئے بیعت لی تھی۔ لوگوں میں یہ احساس ابھرا کہ امیر معاویہ نے انتخاب خلافت کے مسئلہ کو غیر شورائی طریق پر طے کرکے غلطی کی ہے۔ یزید کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے بعد کچھ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یزید اس منصب کا اہل نہیں ہے۔ مسلم معاشرہ میں اس وقت عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، حسین بن علی اور عبدالرحمن بن ابی بکر جیسے جلیل القدر لوگ موجود تھے۔ چنانچہ ایک طبقہ نے یزید کی خلافت پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نئی تحریک کے دو خاص قائد تھے۔ ایک عبداللہ بن زبیر، دوسرے حسین بن علی۔

تاہم صحابہ کرام کی اکثریت اس معاملہ میں یا تو خاموش تھی یا لوگوں کو نصیحت کر رہی تھی کہ یزید کی خلافت کو تسلیم کر لو تاکہ مزید قتل و خون نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس مکہ میں تھے کہ امیر معاویہ کی موت کی خبر آئی۔ لوگ ان کا تاثر جاننے کے لئے ان کے پاس جمع ہوگئے۔ اس موقع پر آپ نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

وان ابنه یزید من صالحی اهله فالزموا مجالسکم واعطوا طاعتکم وبیعتکم	معاویہ کا لڑکا یزید ان کے لائق اہل خانہ میں سے ہے۔ پس تم لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اپنی اطاعت و بیعت اس کو دے دو

بلاذری، انساب الاشراف، یروشلم ۱۹۳۸، قسم ۴، صفحہ ۴

اسی طرح محمد بن حنفیہ نے یزید کے حق میں کلمہ خیر کہہ کر لوگوں کو اس کی بغاوت سے روکا۔ حمید بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ یزید کی ولی عہدی کے وقت میں حضرت بشیر کے پاس گیا جو صحابہ میں سے تھے۔ انھوں نے فرمایا:

یقولون ان یزید لیس بخیر امة محمد صلی الله علیه وسلم وانا اقول ذلك ولكن لان یجمع الله امة محمد احب الی من ان یفترق	لوگ کہتے ہیں کہ یزید امت محمدؐ میں سب سے بہتر نہیں ہے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں۔ لیکن امت محمدؐ کا اتحاد مجھے اس کے اختلاف کی نسبت زیادہ پسند ہے۔

الذہبی، تاریخ الاسلام، جلد ۲، صفحہ ۲۰

یہ نقطۂ نظر دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس واضح ہدایت پر مبنی تھا کہ حکمرانوں سے سیاسی منازعت مت کرو، اور اپنے اصلاحی جذبہ کے اظہار کے لئے عمل کا دوسرا (غیر سیاسی) میدان تلاش کرو۔ مگر تعمیری نقطۂ نظر سیاسی نقطۂ نظر کے مقابلہ میں ہمیشہ کم لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بیشتر لوگ سیاسی معرکہ آرائی کی راہ پر چل پڑے اور نتیجہ میں امام حسین اور عبداللہ بن زبیر جیسے اعلیٰ صلاحیتوں کے انسان اور ان کے علاوہ بے شمار دوسرے مسلمان خود اپنے بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوگئے۔ یزید کو جب معلوم ہوا کہ مکہ و مدینہ کے لوگ باغی ہوگئے ہیں تو اس نے حرمین پر چڑھائی کرائی۔ خانہ کعبہ کی دیواریں ڈھائی گئیں ——— ان تمام قربانیوں کے باوجود اصل مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ یزید کی حکومت کو موت کے فرشتہ کے سوا کوئی ختم نہ کر سکا۔

پہلی صدی ہجری کی ان خانہ جنگیوں کا ایک نقصان یہ ہوا کہ بڑے بڑے صحابہ جو رستم و اسفندیار کو زیر کرتے ہوئے سیلاب کی طرح اسلام کو آگے بڑھا رہے تھے، وہ اجتماعی زندگی سے الگ ہوگئے۔ سعد بن ابی وقاص فاتح ایران شہروں سے دور چلے گئے جہاں وہ اونٹ اور بکریاں چراتے رہتے تھے۔ عبداللہ بن عمر جو اپنی خصوصیات کی بنا پر عمر ثانی

بن سکتے تھے، باہمی جھگڑوں سے دل برداشتہ ہو کر گوشہ گیر ہو گئے، وغیرہ وغیرہ۔ تاہم میدان جنگ سے ان حضرات کی واپسی محض منفی نوعیت کی نہ تھی۔ اس کا ایک مثبت پہلو بھی تھا۔ اب وہ تعلیم و ارشاد کی سرگرمیوں میں لگ گئے۔ احادیث کی روایت کرنا، شریعت اسلام کی حقیقت سمجھانا اور سیرت نبوی سے لوگوں کو آگاہ کرنا اب ان کا مشغلہ تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ حدیث اور سیرت اور اسلامی تاریخ کا ذخیرہ جمع ہوا۔ میدان جنگ میں کارنامہ دکھانے والوں نے میدان درس میں اپنے لئے اسلامی خدمت کا کام تلاش کر لیا۔ ؎

یزید کی ولی عہدی

معاویہ بن ابی سفیان کا اپنے بیٹے یزید بن معاویہ کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا زبردست اختلافی مسئلہ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تقرر نے اسلامی تاریخ میں صرف المیے کا اضافہ کیا ہے۔ تاہم محتاط مبصرین کی رائے ہے کہ معاویہ اپنے تقرر میں نیک نیت تھے۔ وہ دیانت داری کے ساتھ سمجھتے تھے کہ یزید تمام ممالک اسلامی میں خلافت کے لئے سب سے زیادہ اہل ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک "معاویہ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی"۔ عبداللہ بن عمر نے جب اس تقرر پر اعتراض کیا تو معاویہ کا جواب یہ تھا

انی خفت ان اذر الرعیة من بعدی کالغنم المطیرة لیس لها راع	مجھے خوف ہوا کہ میں عوام کو بکریوں کے منتشر گلے کی طرح چھوڑ کر نہ چلا جاؤں جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

(البدایہ والنہایہ لابن کثیر جلد ۸ صفحہ ۸۰)

اس طرح کی متعدد روایتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ معاویہ اپنے انتخاب میں مخلص تھے۔ حتی کہ نقل کیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر انھوں نے دعا کی:

اللهم ان كنت عهدت ليزيد لما رأيت من فضله	اے اللہ اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد

؎ جہاں تک حکام کی اپنی ذمہ داری کا تعلق ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت سخت تنبیہات منقول ہیں:
مَا مِنْ أَحَدٍ مِنَ الْحُكَّامِ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ شَيْئًا لَمْ يَحْفَظْهُمْ بِمَا يَحْفَظُ بِهِ نَفْسَهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا لَمْ يَجِدْ رِيحَ الْجَنَّةِ
(المعجم الصغیر للطبرانی) یعنی حکام میں جو کوئی بھی مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہو پھر وہ اس طرح ان کی حفاظت نہ کرے جس طرح وہ اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے تو وہ جنت کی مہک بھی نہ پائے گا۔

یہ حکم امیر کے لئے ہے۔ مگر جہاں تک مامور کا تعلق ہے، اس کا فرض یہی ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے امیر کی اطاعت کرے خواہ امیر اس کو پسند ہو یا ناپسند۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الجهاد واجب عليكم مع كل امير برا كان او فاجرا وان عمل الكبائر (ابو داؤد، مشکوٰۃ باب الامارۃ) امیر اچھا ہو یا برا، اور خواہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہو، اس کے تحت جہاد کرنا مسلمانوں کے اوپر فرض ہے۔
مطلب یہ ہے کہ حکومتی ادارہ کی اصلاح کے نام پر محاذ نہ بناؤ۔ اس کے تحت دین کی اشاعت و تبلیغ کے جو مواقع ہیں، ان پر اپنی توانائی صرف کرو۔

فبلغه ما املت واعنه، وان كنت انما حملني حب الوالد لولده وانه ليس لما صنعت به اهلا فاقبضه قبل ان يبلغ ذلك

الذہبی، تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر والاعلام
جلد ۲ صفحہ ۲۶۷

بتایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچا دے جس کی میں نے اس کے لئے امید کی ہے۔ اور اس کی مدد فرما۔ اور اگر مجھے اس کام پر صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے تو اس کے خلافت تک پہنچنے سے پہلے اس کی روح کو قبض کرلے۔

تاہم یہ سوال باقی ہے کہ ایک ایسے شخص کو ممالک اسلامی کی خلافت کے لئے نامزد کرنے پر وہ کیسے مطمئن ہوگئے جس کے بارے میں اصحاب رسول میں سے صرف ایک بزرگ (مغیرہ بن شعبہ) کی حمایت انھیں حاصل تھی۔ بقیہ اصحاب جو اس وقت ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے، یا تو اس تقرر کے خلاف تھے یا افتراق امت سے بچنے کے لئے انھوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ نیز یہ کہ خود معاویہ بن ابی سفیان مسلّم طور پر ایک انتہائی دور اندیش آدمی تھے۔ عمر فاروقؓ کے الفاظ میں وہ غصہ کے وقت ہنسنے والے (من یضحک فی الغضب) آدمی تھے۔ ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کرنے کی صلاحیت ان میں حیرت انگیز حد تک پائی جاتی تھی۔ ایسے ایک مدبر نے ایک ایسی رائے کی صحت پر کیسے یقین کرلیا جس کی صحت و اصابت کی تصدیق بعد کی تاریخ نے نہیں کی۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ ۴۱ھ میں جب حسن بن علی نے ایک عظیم سیاسی نزاع کو ختم کیا اور معاویہ کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کرلی تو، اگرچہ یہ امام حسن کی فرمائش کے طور پر نہیں تاہم بطور خود امیر معاویہ نے عبداللہ بن عامر کے سامنے زبانی طور پر یہ اقرار کرلیا تھا کہ ان کے بعد امام حسن خلیفہ ہوں گے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

كان معاوية لما صالح الحسن عهد للحسن بالامر من بعده، فلما مات الحسن قوي امر يزيد عند معاوية ورأى انه لذلك اهلا

(البدایہ والنہایہ، جلد ۸ صفحہ ۸۰)

جب معاویہ نے حسن سے صلح کی تھی تو حسن کو اپنے بعد خلافت کا ولی عہد بنانا منظور کرلیا تھا۔ مگر جب حسن کی وفات ہوگئی تو یزید کی طرف معاویہ کا رجحان قوی ہوگیا۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ خلافت کا اہل ہے۔

حسن بن علی نے معاویہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو کر جو بے مثال قربانی دی تھی، اس کا یہ صرف ایک ادنیٰ صلہ تھا کہ وہ ان کے لائق بھائی حسین بن علی کے حق میں وعدۂ ولی عہدی کو پورا کردیتے۔ مگر یہ بات بھی معاویہ کے ذہن میں جگہ نہ پا سکی۔ اور انھوں نے پورے اصرار اور اہتمام کے ساتھ اپنے بیٹے یزید کو خلافت کے منصب کے لئے نامزد کردیا اور اس کے لئے لوگوں سے بیعت لی۔

جہاں تک یزید کی نااہلی کا سوال ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ اس کے عہد حکومت میں حسین بن علی کو قتل کیا گیا۔ یہ نہ صرف ایک ظالمانہ فعل تھا، بلکہ سیاسی اعتبار سے مکمل طور پر ایک غیر مدبرانہ اقدام تھا۔ یزید کو ایک عظیم مملکت کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے جاننا چاہئے تھا کہ رسول کے نواسے کو قتل کرنا لازماً اپنا رد عمل پیدا کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حتی کہ اس سے نمٹنے کے لئے اس کو مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنا پڑا جس میں حرمین کے تقریباً دو ہزار مسلمان

مارے گئے۔ حسین کے قتل کے بعد جماعت المسلمین کے خون کو حلال کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہو گیا۔

دوسری بات جس سے یزید مکمل طور پر بے خبر رہا، وہ یہ کہ ایک شریف انسان سے مصالحت کا امکان آخر وقت تک ہوتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حسین نے اگرچہ مکہ سے نکلنے کے معاملہ میں اپنے بزرگوں اور دوستوں کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا تھا، وہ یزید کو اس کے آخری انجام تک پہنچانے سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے۔ تاہم کربلا پہنچ کر جب انھیں معلوم ہوا کہ کوفہ والوں کے جن خطوط پر انھوں نے اس حد تک بھروسہ کر لیا تھا کہ اپنے اہل و عیال سمیت گھر سے نکل پڑے تھے، وہ محض دھوکا تھے۔ تو امام حسین نے طے کر لیا کہ سیاست کو یزید کے حوالے کر کے خاموش زندگی پر قانع ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ یزید و حسین کا قضیہ، کم از کم اپنے آخری مرحلہ میں، ٹھیک اسی نقطہ پر پہنچ چکا تھا جہاں معاویہ و حسن کا قضیہ پہنچا تھا۔ مگر معاویہ ایک جہاں دیدہ آدمی تھے۔ انھوں نے سادہ کاغذ پر اپنا دستخط اور مہر ثبت کر کے حسن بن علی کے پاس بھیج دیا کہ صلح کی جو شرائط چاہو اس پر لکھ دو۔ اس کے برعکس حسین بن علی کی اسی قسم کی پیش کش پر یزید کے آدمیوں نے حسین کو قتل کر دیا۔ یزید اگرچہ میدان جنگ میں موجود نہ تھا۔ اس نے امام حسین کا سر دیکھ کر ان کے قتل پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ تاہم وہ اس جرم سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ کوئی صاحب اقتدار اپنے گرد جو فضا بناتا ہے اسی کے مطابق اس کے ماتحت عمل کرتے ہیں۔

یزید کی ولی عہدی کا واقعہ بتاتا ہے کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ بھی آدمی کتنی بڑی غلطی کر سکتا ہے۔ آدمی عام طور پر اپنی پسند ناپسند سے مغلوب (Obsessed) رہتا ہے۔ اس کے قریبی حالات اس کا جو مزاج بنا دیتے ہیں، بس اسی کے تحت وہ سوچنے لگتا ہے۔ اس کی فکر ایک قسم کی متاثر فکر (Conditioned Thinking) بن جاتی ہے۔ وہ نیک نیت ہو کر بھی غلط فیصلے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شورہ کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ شورہ کے ذریعہ ایک کی غلطی دوسرے پر واضح ہوتی رہتی ہے۔ اور جہاں تک اجتماعی امور کا تعلق ہے، اس کے لئے تو مشورہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا جمعہ کی نماز کے لئے جماعت ——— معاویہ بلاشبہ نیک نیت تھے۔ تاہم ان کا فیصلہ متاثر ذہن سے نکلا ہوا فیصلہ تھا جس میں ان حقائق کی رعایت شامل نہ تھی جو ان کے اپنے ذہن کے باہر انتہائی عریاں شکل میں پائے جا رہے تھے۔

الامر اسرع من ذلك (فیصلہ کی گھڑی زیادہ قریب ہے)

کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے یزید کو بلا کر کچھ نصیحتیں کیں۔ اس میں انھوں نے کہا: "بیٹے! میں نے تم کو پالان کسنے اور سفر کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔ دشواریوں کو آسان، دشمنوں کو تابع اور عرب کی گردنوں کو مطیع بنا دیا ہے۔ میں نے تمھارے لئے وہ چیزیں فراہم کر دی ہیں جو اس سے پہلے کسی نے فراہم نہیں کیں۔" (محمد بن علی بن طباطبا، تاریخ الفخری)

آدمی پر جب کسی خیال کا غلبہ ہوتا ہے تو اکثر وہ حقائق اس سے اوجھل ہو جاتے ہیں جو اس کے خلاف جا رہے

ہوئے۔ ایسا ہی امیر معاویہ کے ساتھ ہوا۔ وہ دو انتہائی سنگین حقیقتوں کو بھول گئے۔ ایک یہ کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کو شوریٰ کے اختیار میں دیا گیا ہے۔ ایک حکمراں کا اپنے بیٹے کو خلیفہ نامزد کرنا اسلام کے مزاج کے خلاف ایک واقعہ ہوگا جو ضرور اپنا ردعمل پیدا کرے گا۔ اس طرح ان کے حریف بنو ہاشم کو اموی اقتدار کے خلاف اپنی تحریک کو زندہ کرنے کے لئے ایک نظریاتی بنیاد ہاتھ آجائے گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ امیر معاویہ کے دنیا سے جاتے ہی تمام اسلامی ممالک میں یزید کے خلاف شورش شروع ہوگئی۔ خلیفہ کی حیثیت سے اپنی عمر کا ایک دن بھی اس نے چین سے نہیں گزارا۔

دوسری اہم بات جس کو امیر معاویہ بھول گئے، وہ یہ کہ جس موت کے کنارے کھڑے ہو کر وہ اپنے بیٹے کو وصیت کر رہے ہیں، ان کا بیٹا بھی بہت جلد وہیں پہنچنے والا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یزید بن معاویہ کو مشکل ساڑھے تین سال حکومت کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد وہ مر گیا۔ یزید کے بعد امیر معاویہ کا پوتا معاویہ بن یزید بن معاویہ (۶۴ — ۶۴ھ) تخت نشین ہوا۔ مگر وہ صرف تین ماہ میں ختم ہو گیا۔ امیر معاویہ کی وفات کے بعد چار سال سے بھی کم مدت میں خلافت، معاویہ کے بیٹوں اور پوتوں سے نکل کر مروان بن حکم بن ابی العاص بن امیہ (۶۴ — ۶۵ھ) کے گھرانے میں چلی گئی۔

معاویہ اگر انسان کے اس غیر یقینی مستقبل کو دیکھ لیتے تو وہ شاید ایسا اقدام نہ کرتے جس نے مورخ کو یہ لکھنے کا موقع دیا کہ: "معاویہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں قیصر و کسریٰ کی سنت کو رواج دیا۔"

دوسری طرف غیر صالح حکمرانوں کو بے دخل کرنے کا علم بلند کرنے والوں کے لئے بھی اس واقعہ میں بہت بڑی نصیحت ہے ــــــ آدمی اگر صبر کا طریقہ اختیار کرے اور اپنے اصلاحی عمل کو اپنے ممکن دائرہ میں محدود رکھے تو بہت جلد اس کو معلوم ہوگا کہ مالک کائنات زیادہ بہتر اور کامیاب طور پر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کی تدبیر کر رہا ہے جس کو ہم اپنی بے صبری کی وجہ سے صرف ناکام طور پر وقوع میں لانا چاہتے ہیں۔

یہ مقالہ ایک تقریر پر مبنی ہے جو ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ کو برہان پور (مدھیہ پردیش) میں حلقہ نیرنگ خیال کے زیر اہتمام ایک اجتماع میں کی گئی۔